© rasailojaraid.com

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ان کے افکار

عذرا وقار

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ (۱۳۲۱۔۱۴۲۲) کا پورا نام سید صدرالدین ولی اکبر ابوالفتح محمد حسینی گیسو دراز تھا۔ ان کا نام محمد، کنیت ابوالفتح اور لقب صدرالدین ولی الداکبر الصادق تھا۔ وہ دہلی میں پیدا ہوئے اور شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی (۱۳۵۶) کے خلیفہ تھے۔ خواجہ صاحب چشتیہ سلسلے سے وابستہ سیادت وعلم ولایت کے جامع، بڑے رفیع الدرجہ عظیم البرکت اور اسرار طریقت میں خاص مہارت رکھتے تھے[۱]۔ سات برس کی عمر میں جب سلطان محمد تغلق نے تمام باشندگان دہلی کو دولت آباد جانے کا حکم دیا تو خواجہ صاحب اپنے والد حضرت یوسف حسینی کے ہمراہ دولت آباد تشریف لے گئے۔ جہاں وہ اپنے والد اور دادا جو دونوں حضرت نظام الدین اولیاؒ (۱۳۲۵) کے مرید تھے اور بعض دیگر اساتذہ کے زیر تعلیم رہے۔ اس عرصہ میں آپ نے قرآن مجید حفظ کیا اور صرف ونحو اور فقہ اور اصول فقہ پر کتابیں پڑھیں۔ وہ اپنے والد اور نانا سے حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کے فضائل وکمالات ظاہری و باطنی کی باتیں سنا کرتے تھے۔ چنانچہ انہیں ان سے غائبانہ عشق ہوگیا۔ ان کے والد کا تین برس بعد انتقال ہوگیا۔ بعدازاں جب آپ پندرہ برس کے تھے تو اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ دہلی آئے اور حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کے مرید ہوئے۔ انہوں نے اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور قاضی عبدالمقتدر شریحی الکندی، تاج الدین بہادر، شرف الدین کیتھلی اور عمادالدین تبریزی سے صرف ونحو، اصول فقہ، حدیث تفسیر، معقول اور منقول کی تعلیم حاصل کی اور علم باطنی میں بھی مدارج طے کئے۔

حضرت خواجہ، حضرت امام زین العابدینؒ کی اولاد میں سے تھے۔ ان کا سلسلہ نسب اور سلسلہ طریقت دونوں بائیسویں واسطے سے حضرت محمد تک پہنچتا ہے۔ آپ کے زمانے میں سادات سر کے بال بڑھایا کرتے تھے چنانچہ آپ کی بھی زلفیں دراز تھیں اور اس لئے لوگ انہیں گیسو دراز کہتے تھے[۲]۔ انیس برس کی عمر میں تعلیم ختم کر کے خواجہ صاحب حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کی خدمت میں آ گئے اور سترہ برس ان کی تربیت میں رہے اور پھر ان کے جانشین بنے۔ مرشد کی وفات کے وقت آپ کی عمر چھتیس برس تھی۔ چالیس برس کی عمر میں انہوں نے مولانا سید جمال الدین مغربیؒ کی پوتی سے نکاح کیا۔ مولانا جو خود نہایت بلند پایہ صوفی، محدث اور فقیہہ تھے اور عمر میں خواجہ صاحب سے ساٹھ برس بڑے تھے اور خواجہ صاحب اس وقت بیس برس کے تھے جب مولانا ان کے مرید ہوئے، بقول مولانا ''سید محمد تم ایک ایسے درویش ہو جنہوں نے ہم کو مسلمان بنا دیا''[۳]۔ خواجہ صاحب دہلی میں سجادہ ارشاد پر متمکن ہو کر خلق خدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو ہدایت دیتے رہے۔ پھر تیمور کے حملہ کے وقت آپ نے وہاں سے ہجرت کی، گلبرکہ میں مقیم ہوئے اور وہیں وفات پائی۔ گلبرکہ میں آپ کا قیام بائیس برس رہا۔ اس عرصہ میں علوم وفنون، ارشاد و ہدایت، تصنیف و تالیف کے ذریعے ان کے فیوض و برکات جاری رہے۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ایک صوفی، عالم، شاعر، محدث، محقق اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی حیثیت اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ابن العربیؒ (۱۲۴۰) کے نظریہ وحدت الوجود کے مدمقابل ایران سے ابھرنے والے نظریہ وحدت الشھود کی برصغیر میں بنیاد ڈالنے والے صوفیہ میں خواجہ صاحب بھی شامل تھے۔ اسی رجحان نے آگے چل کر حضرت مجدد الف ثانیؒ کو اس نظریہ کو مستحکم کرنے کیلئے ٹھوس بنیادیں فراہم کیں۔ جس نظریے نے برصغیر کے مسلمانوں کو علیحدہ تشخص دیا۔ خواجہ صاحب ابن العربیؒ کے خیالات کو کج اور منحرف گردانتے تھے[۴]۔ ان کے خیال میں ابن العربیؒ عالم غیب کو چھوڑ کر عالم شواہد پر راضی ہوگئے تھے۔ وہ موجودات حاضرہ کے علاوہ اور دوسرے موجودات کے قائل نہیں تھے اور عالم موجودات کی تمام صورت اور شکلوں کو وہ اللہ کی ہی شکل وصورت بتاتے تھے۔ اس دنیا سے پرے کی ان کو خبر نہ تھی۔ لکھتے ہیں ''اگر وہ میرے زمانے میں ہوتے تو ان کو ان شواہد سے واپس لے آتا اور بلندی پر پہنچاتا اور ان کو اس دنیا سے پرے کا نظارا کرا دیتا''[۵]۔

خواجہ صاحب کے عہد میں فیروز تغلق راسخ العتقادی کو رائج کرنا چاہتا تھا۔ اس وجہ سے وحدت الوجود کے نظریے پر یقین رکھنے والے صوفیہ زیر عتاب آئے۔ اس سے قبل ایرانی صوفی شیخ علاوالدولہ سمنانی (۱۲۶۱) نے نظریہ وحدت الوجود کی مخالفت کی اور ان کے کئی مرید ہندوستان بھی آئے اور یہاں وحدت الشھود کے نظریات کا پرچار کیا۔ خواجہ صاحب انہیں نظریات کے زیر اثر تھے[۶]۔ اپنے مکتوبات میں خواجہ صاحب نے ابن العربیؒ کے علاوہ فریدالدین عطارؒ اور مولانا رومؒ کے وحدت الوجودی خیالات کی مخالفت کی ہے۔ اس کے علاوہ وہ ابن العربیؒ کے دیگر نظریات جیسے جنت، دوزخ اور قیامت کے بارے میں ان کے عقیدے سے بھی اتفاق نہ کرتے تھے جن کے خیال میں یہ محض انسان کی اندرونی کیفیات کی علامتیں تھیں۔ خواجہ صاحب خدا اور انسان کی محبت کو برابری کی سطح پر نہ دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں وہ خالق اور انسان مخلوق ہے اور یہ فاصلہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے[۷]۔

خواجہ صاحب ابوالنجیب سہروردیؒ (پ۔ ۱۰۹۷) کے معتقد تھے اور ابوالنجیب سہروردیؒ کے خیال کے مطابق خدا جسم نہیں ہے کیونکہ جسم مرکب ہوتا ہے اور کسی ترکیب دینے والے کا محتاج ہوتا ہے۔ نہ وہ جوہر ہے کیونکہ جوہر کے لئے جگہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ وہ عرض ہے کیونکہ عرض کے لئے زمانہ درکار ہے اور خدا ہمیشہ رہنے والا ہے۔ نہ عبارتوں سے اس کو بیان کیا جا سکتا ہے اور نہ اشارات سے اسکا تعین کیا جا سکتا ہے۔ نہ انسانی افکار اس کا احاطہ کر سکتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں اور نہ بینائیاں اس کو دیکھ سکتی ہیں۔ ہمارا و ہم اس کی نسبت جو بھی تصور کرے یا فہم اس کو جیسا بھی سمجھے خدا تعالیٰ اس کے سوا ہے اور اس سے ارفع و اعلیٰ ہے [8]۔ چنانچہ انہی اعتقادات کے زیر اثر وہ ابن العربی کے نظریہ وحدت الوجود کو صحیح تسلیم نہ کرتے تھے اور خود خواجہ صاحب باشرع صوفیہ کے حلقے میں شامل تھے۔ آپ حضور انور حضرت محمدؐ کے طریقے پر پوری طرح گامزن تھے۔ پانچوں وقت باجماعت نماز ادا کرتے اور اپنی تصانیف میں بار بار انہوں نے اتباع شریعت پر زور دیا ہے۔ وہ اپنے مریدوں کو ہمیشہ نگاہ اور زبان کی حفاظت کرنے اور طریقۂ شریعت پر عمل کرنے اور پانچ وقت باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی تلقین کرتے تھے [9]۔ ان کے خیال میں بغیر حضوری قلب کے نماز نہیں ہوتی [10]۔ مذہب کی تعبیر کے سلسلے میں علماء اور صوفیہ دو مختلف طبقہ ہائے خیال سے تعلق رکھتے ہیں۔ علماء لوگوں کو نماز کے محض ظاہری مطلب تک لے جاتے ہیں اور اس کے گہرے مطالب سے دور رکھتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب کے مطابق لوگوں کو دین کے بارے میں چند کتابیں پڑھا دینے اور چند باتیں یاد کرا دینے سے دین کی سمجھ پیدا نہیں ہوتی کیونکہ دین محض رسومات کا نام نہیں کہ بس انسان یہ جان لے کہ کونسی نماز کا وقت ہے اور یہ کہ قرآن کے الفاظ کا مخرج کیا ہے۔ بلکہ انسان کے لئے نماز کی روح کو سمجھنا ضروری ہے اور اس کے لئے حضوری قلب اہم ہے۔ علماء کے خیال میں چونکہ انسان کو دل پر اختیار نہیں رہتا اور ادھر ادھر سے خیالات آتے رہتے ہیں اس لئے نماز میں حضوری ممکن نہیں۔ جبکہ صوفیہ کے خیال میں جب دل پر خدا کا عکس پڑتا ہے تو تمام وسوسوں سے پاک ہو جاتا ہے [11]۔ حضرت خواجہ کبرائے طریقت کے ہم پلہ اور برگزیدہ ترین صوفی تھے۔ وہ ایک جامع کمالات اور قادر الکلام بزرگ تھے [12] جو علوم ظاہری میں بھی نہایت بلند درجہ رکھتے تھے۔ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے ان کے وفورِ علم و تحقیق کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ تفسیر میں، حدیث و اصولِ حدیث و رجال میں، فقہ اور اصول فقہ میں مکرم اور بلاغت و صفی میں، ادب اور شعر میں بڑے بڑے آئمہ کے ہم سر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے زمانے میں ہندوستان میں علم حدیث معدود تھا اور حدیث دانی کا دار و مدار صرف ''شارق الانوار'' اور ''مصابیح'' پر تھا۔ لیکن حضرت مخدوم کی تصانیف سے نہ صرف نفس حدیث میں بلکہ رجال اور اصول حدیث میں بھی ان کے وفور علم اور وسعت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ معانی حدیث میں جیسی ان کی نظر باریک ہے اس کی نظیر کم ملتی ہے [13]۔

چشتیہ سلسلے کے بزرگوں نے حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ تک کسی نے بھی تصنیف و تالیف کی جانب توجہ نہ دی حالانکہ ان میں سے ہر بزرگ علوم ظاہری میں بھی محققین اور مجتہدین کا درجہ رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں مخدوم خواجہ بندہ نوازؒ ہی پہلے بزرگ تھے جنہوں نے اس طرف توجہ دی اور بڑی بڑی کتابیں اور چھوٹے چھوٹے رسالے بکثرت تحریر کئے جن میں کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

ملتقط تفسیر قرآن، اول پانچ پاروں کی تفسیر بطرز کشاف، شرح شارق الانوار، شرح عوارف المعارف،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترجمہ عوارف (فارسی)، شرح تعرف، شرح آداب المریدین (عربی) شرح آداب المریدین (فارسی) شرح نصوص الحکم، شرح تمہیدات عین القضات ہمدانی، شرح رسالہ قشیریہ، رسالہ عشقیہ، اسماالاسرار، حدائق الانس، استقامت شریعت بطریق الحقیقت، حواشی قوت القلوب، شرح فقہ اکبر در عربی، شرح فقہ اکبر در فارسی، رسالہ وجود العاشقین، رسالہ در رویت باری تعالیٰ، کرامات اولیاء، رسالہ درمیان حدیث رویت ربی فی احسن صورت، شرح الہامات حضرت سید عبدالقادر جیلانی، رسالہ در ذکر، رسالہ در مراقبہ، رسالہ در آرام، رسالہ ضرب المثال [14]۔ ان کے علاوہ ان کے مکتوبات، دیوان شاعری اور ملفوظات بھی شامل ہیں۔ ان کے ملفوظات جوامع الکلام میں کئی تصنیفات کا ذکر ہے جس کا وہ درس بھی دیتے تھے۔ انہیں سنسکرت بھی آتی تھی اور ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کی روشنی میں برہمنوں سے ہمہ اوست کے فلسفے پر اس شرط پر بحث کرتے تھے کہ جو جیت جائے گا دوسرا اسکا مذہب قبول کرے گا۔ مگر ان کے بقول برہمن بعد ازاں اپنی بات پر قائم نہ رہتے تھے [15]۔

حضرت خواجہ کبھی اپنے ہاتھ سے نہ لکھتے تھے بلکہ کاتب کو لکھوا دیتے اور کسی کتاب کو لکھوانے کے بعد نظر ثانی نہ کرتے نہ کبھی پڑھوا کر سنا کرتے تھے۔ اپنے ملفوظات میں کہتے ہیں: [16]

> میں نے خواجہ نصیرالدین چراغ دہلویؒ کی زندگی میں کوئی کتاب اور رسالہ تصنیف نہیں کیا۔ مبادا وہ کتاب ان کی نظر سے گذرے اور اس کو میری شیخی خیال کریں اور بدگمان ہوں۔ اپنے شیخ کی وفات کے بعد میں نے تقریر و تحریر سے کام لیا اور کچھ کتابیں لکھیں [17]۔

اپنی تصانیف میں انہوں نے ایسے اختلافات پر بھی رائے زنی کی ہے جن کے بارے میں مختلف صوفیہ وقتاً فوقتاً اظہار کرتے رہے ہیں جیسے منصور حلاج کا انا الحق کہنا، سماع، رویت باری، پیر کی اہمیت وغیرہ۔ منصور حلاجؒ کے بارے میں کہتے ہیں کہ لوگوں نے ''انا الحق'' کے بارے میں غلط مطلب نکالے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منصور حلاجؒ کا یہ کلام خلاف شرع نہ تھا بلکہ وہ از خود رفتہ ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھے تھے اور خود اللہ نے ان کے مظہر میں انا الحق پکارا تھا۔ جس طرح درخت کے مظہر میں حضرت موسیٰؑ سے اللہ نے کلام کیا اسی طرح منصور حلاجؒ کے مظہر میں اللہ نے ''انا الحق'' کی آواز نکالی اور اسی طرح اللہ نے نبیؐ کے مظہر میں کلمات قدسی کو بیان فرمایا [18]۔ سماع کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ سماع خاص شرائط کے ساتھ جائز ہے مگر اس سلسلے میں بہت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے اور سماع کو پورے آداب کے ساتھ سننا چاہیئے۔ سماع کے وقت آدمی باخود بھی ہو اور بے خود بھی [19]۔ وہ نہ کچھ کرنے پر قادر ہو اور نہ نہ کرنے پر۔ سماع کا مقصد اپنے خیالات کو مجتمع کرنا اور دل کو متوجہ اور یکسو کرنا ہے۔ سماع سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ دل سوائے ایک مطلب کے ہر شے سے خالی ہو جاتا ہے اور یک گونہ بے خودی اس پر طاری ہو جاتی ہے۔ یہی اجتماع خیال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور توجہ خاطر محبوب تک پہنچا دیتا ہے[۲۰]۔ سماع کے مخالف اور منکر لوگوں کو اس میں شریک نہیں ہونا چاہیئے۔ استادِ بے درد، دانشمند بغیر صفائی قلب، مغرور بے راہ اور ناہموار اشخاص کو بھی مجلس سماع میں نہیں آنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اگر انسان کے ذہن میں کوئی غم ہو تب بھی سماع نہیں سننا چاہیئے کیوں کہ اس سے نفس کی سرگوشیوں کا ڈر ہوتا ہے۔ نہ ہی کسی تکلیف، درد اور زخم وغیرہ کی صورت میں سماع میں آنا چاہیئے کیوں کہ دنیوی رشتوں کا غم عشق الٰہی کے درد سے مل کر اخلاص میں کمی کر دیتا ہے[۲۱]۔

ان کے ملفوظات میں درج ہے کہ انہوں نے ایک بار ایک محفل کا حال سنایا جس میں مولانا جمال الدین مغربیؒ اور دیگر حضرات سماع کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ اس میں ہاتھ پاؤں ہلانا مناسب نہیں اور یہ کہ بغداد کے صوفیہ بالکل حرکت نہیں کرتے بلکہ صرف منہ سے اللہ اللہ کہتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو بہتے جاتے ہیں۔ اس پر حضرت نے بتایا کہ وہ سماع کے دوران صرف آہ بھرتے ہیں جس سے مراد ہے کہ صرف اللہ ہی مخزن جمال ہے۔ پھر دونوں ہاتھ کھول کر ایک دوسرے پر رکھ دیتے ہیں جس سے مراد ہے کہ سوائے خدا کے اور کسی شے کا وجود نہیں اور دونوں ہاتھوں کے اشاروں سے دونوں جہان کو لپیٹ کر ایک گوشے میں رکھ دیتے ہیں یعنی سب کچھ ترک کر کے اپنے مطلوبِ واحد، ذات حق کی طرف رجوع کرتے ہیں[۲۲]۔

خواجہ صاحب کو شکایت تھی کہ وہ پچاس سال سے کسی سچے طالب حق کی تلاش میں ہیں لیکن انہیں کوئی ایسا طالب نہیں ملا جو ان کے خیال کے مطابق صحیح طالب ہو۔ اپنے مریدوں میں سے چند کو بڑی محنت سے انہوں نے کچھ بنایا اور دریائے سلوک کے کچھ قطرے ان کے کام و دہن میں ٹپکائے بھی مگر وہ بھاگ نکلے اور کھانے، پہننے اور رقص و تماشہ میں مشغول ہو گئے۔ اپنے مریدوں کو تلقین کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ صحبت کا انسان پر بہت اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ راہ طریقت میں عاشقان خدا کو خدا کے دوستوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے۔ صوفیوں کو فقیہوں اور دانش مندوں کی صحبت اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ لوگ ہر وقت تشویش اور تعلق میں رہتے ہیں اور یہ ناآسودہ اور غیر مطمئن لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ جو ان کے ساتھ رہے گا ناآسودہ اور غیر مطمئن رہے گا[۲۳]۔ چونکہ ظاہری علم بخل سکھاتا ہے اس لئے دانش مندوں کو مال جمع کرنے کی ہوس ہوتی ہے۔ یہ لوگ خود کم خرچ کرتے ہیں اور جو ان پر خرچ کرے اس کو پسند کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک ہاتھ روک کر خرچ کرنے سے زندگی کو تقویت ملتی ہے۔ علماء کے اندر ان کا ظاہری علم یقین میں ضعف پیدا کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ لوگ اس گروہ میں شامل ہو گئے جس کو حضرت محمدؐ نے حبس مال کا حکم دیا[۲۴]۔ اسی طرح انہوں نے مریدوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ طالب حق کو ابتداء میں مباحثے نہیں کرنے چاہیں تاکہ نفس کی کدورت کی بدبختی جوش میں نہ آئے اور اسے دعا کرنا چاہیئے کہ صحیح بات مخالف کی زبان سے نکلے تاکہ اس کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نفس شکستہ و ذلیل ہو۔ طلبِ الٰہیٰ میں خودنمائی اور خودکامی کی گنجائش نہیں۔ نہ ہی طالب کو سوال کرنے میں ابتداء کرنی چاہیئے۔ کیونکہ بحث و مباحثے انسان میں تکبر، غرور، کینہ، تجسّس، غصہ، مبالغہ اور خود بینی پیدا کرتے ہیں اور ظاہری شان و شکوہ کو بڑھاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے نزدیک علم باطن اور ظاہر میں وہی فرق ہے جو مغز اور پوست میں ہوتا ہے۔ اسی لئے ظاہری علم حاصل کرنے والا تمام عمر وسوسوں، خطرات اور پراگندگی میں اپنے دل کو مبتلا رکھتا ہے اور اس کو بڑا کام سمجھتا ہے۔ اسی طرح سوداگر ہر وقت اپنے مال کی ہوس میں رہتے ہیں۔ ان کو سوائے اس کے کوئی آرزو نہیں ہوتی کہ مال اور منافع دگنا ہو جائے۔ اسی اندیشے میں ان کا مال ریت کی طرح اڑتا رہتا ہے۔ لیکن مال کا خطرہ دل کو سیاہ اور مکدر بنا دیتا ہے۔ چنانچہ سوداگر کو ہر وقت اپنے مال ہی کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیئے اور نفسانی خواہشات کے پیچھے دوڑنے سے خود کو بچا کر رکھنا چاہیئے [۲۵]۔

لکھتے ہیں کہ خشک سالی کے دوران بادشاہ کو نیک دلی سے خدا سے دعا مانگنی چاہیئے۔ بادشاہ اگر خود کو تمام فقراء، مساکین اور گرے پڑے لوگوں سے کمتر خیال کرے گا تو جو کچھ مانگے گا اس کو ملے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خود پھٹا پرانا، میلا کچیلا کپڑا کمر سے باندھ کر اور پرانا پیوند لگا جامہ میلا کچیلا کاندھے پر رکھے اور سر برہنہ ہو کر ہاتھ میں کدال لے اور چند گز زمین اسی کدال سے اپنے ہاتھ سے کھودے اور جو کا بیج بوئے۔ پھر قبلہ رو کھڑے ہو کر عجز و زاری اور شکستگی اور درماندگی کے ساتھ اللہ سے بارش کے لئے دعا مانگے۔ انشاء اللہ بارش ہوگی [۲۶]۔ کیونکہ خدا نیک دلی سے مانگی گئی دعا ضرور سنتا ہے۔ جب مصر میں عظیم قحط پڑا تو حضرت یوسف ہفتہ میں ایک مرتبہ لوگوں کو اپنا چہرہ دکھا دیتے اور دوسرے ہفتے تک لوگ اس جمال بے مثال کی طاقت پر بغیر آب و دانہ کے گذار لیتے [۲۷]۔ چنانچہ خدا کے برگزیدہ بندے انسانوں کی مشکلات کا ازالہ کر سکتے ہیں۔ رویت باری صوفیہ اور فقہا کے درمیان ایک اختلافی مسئلہ ہے یعنی کیا اس زندگی میں خدا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کے خیال میں اکثر فقہا رویت باری کو خواب میں جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن کچھ صوفیہ کے لئے خواب اور بیداری یکساں ہے۔ وہ بیداری میں بھی رویت باری کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کو بیان کرنا مشکل ہے اور اس دوران جو محبت اور صورت ان کے دل میں نقش ہوتی ہے ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اللہ اس سے پاک ہے کہ اس کو بیان کیا جائے۔ اللہ کو اللہ ہی کے نور کے ذریعے تمام بدن کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے [۲۸]۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ان پر اللہ نے اسی زندگی میں تجلی فرمائی ہے اور انہوں نے اسے اچھی طرح دیکھا اور سمجھا ہے۔ اور یہ محض حسن ظن اور تخیل نہیں ہے بلکہ بہ تحقیق و یقین ہے [۲۹]۔ پروردگار کی تجلی طالب پر اس طرح پڑتی ہے کہ اگر اس وقت تجلی کے سامنے پہاڑ بھی آ جائیں تو ریت کے ذرے بن جائیں اور اگر وہ آگ پر پڑے تو اس میں جلانے کی طاقت نہ رہے۔ اس تجلی کے اثرات انسان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور ان اعضاء کو دست قدرت قوی، مکمل اور لطیف بنا دیتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے [۳۰]۔ انسان کے جسم پر جب تجلی پڑتی ہے تو انسانی جسم سات ٹکڑوں میں یا اس سے بھی زیادہ میں تقسیم ہو جاتا ہے اور بند بند جدا ہو جاتا ہے۔ پھر ہر بند سے اس کا ایک جثہ باہر آتا ہے اور پھر جملہ جثے ای ایک میں واپس چلے جاتے ہیں [۳۱]۔

صوفیہ عموماً اور چشتیہ سلسلے میں خصوصاً پیر کی ذات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ خواجہ صاحب کے خیال میں پیر پیرِ کارواں ہوتا ہے اور منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے سالک کو ایسے پیر کی احتیاج ہے جو اس راستے سے کما حقہ واقف ہو۔ اس کے نشیب و فراز کو جانتا ہو۔ اس کے مہالک کو پہچانتا ہو۔ راہزنوں اور قطاع الطریق سے مقابلہ کرنے اور ان کو دفع کرنے کی قوت رکھتا ہو۔ اگر سالک چلتے چلتے راستے میں تھک جائے اور پست ہمت ہو جائے تو اس کو قوت و ہمت دے سکے بلکہ اگر ضرورت پیش آئے تو خود اپنی پیٹھ پر اٹھا کر آگے لے جا سکے۔ راستے کی دشواریوں سے بچانے کے ساتھ ساتھ وہ راستے کے مناظر اور دلفریبیوں سے بھی سالک کو بچاتا ہے اور ان میں پھنسنے نہیں دیتا۔ جب سالک کو پیر کامل مل جائے تو اس کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے اور اس کی فرمانبرداری کرنی چاہیئے۔ مرید کو پیر کے سامنے حاضر ہوتے ہوئے اپنی آنکھیں اس کے چہرے پر رکھنی چاہیں۔ شیخ کی مجلس کو حق تعالیٰ کی مجلس سمجھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ حق پر ہوتا ہے۔ پیر کے سامنے ذکر و مراقبہ میں مشغول نہیں ہونا چاہیے۔ ہر وقت پیر کے حضور رہنا چاہیئے کیونکہ اس کی ایک بات وہاں پہنچا سکتی ہے جہاں سو سال کی عبادت بھی نہیں پہنچا سکتی۔ پیر کا نام ہر وقت زبان پر اور دل میں اس کا تصور رکھنا چاہیئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرید پیر کے دل میں اللہ کو اور پیر مرید کے دل میں خود کو دیکھتا ہے۔ پیر انوار لاہوتی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کا احترام و اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ پیر دراصل اللہ کا سفیر اور اس کے خزانے کا امین ہے۔ مرید کو جو کچھ ملتا ہے اسی کے خزانے سے ملتا ہے۔ پیر ایک دودھ پلانے والی ماں کی طرح نہ صرف اسے کھلاتا پلاتا ہے بلکہ اس کی حفاظت بھی کرتا ہے [۳۲]۔ مرید کو ابتداء میں اپنی وارداتِ قلب کے بارے میں پیر کو مطلع کرتے رہنا ضروری ہے۔ سالک کے لئے تزکیہ نفس اور توجہ تام اور اس کے لئے وجدان اور سوز دلی ضروری ہے۔ ان سب مراحل میں پیر کی توجہ اور ہدایت ضروری ہے۔ اگر سالک کا دل مراقبے میں نہ لگے تو اسے عشقیہ غزلیں اور عشقیہ قصوں میں دل لگانا چاہیئے تاکہ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی کی طرف جا سکے۔ اگر پھر بھی کامیاب نہ ہو تو اسے صحرا میں نکل جانا چاہیئے اور نماز کے بعد صرف دل کی حاضری کی دعا کرنی چاہیئے کیونکہ حضوری تمام سعادتوں کی روح اور خمیر ہے۔

خود خواجہ صاحب نے سترہ برس تک اپنے شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی خدمت کی اور پھر وہ خود کو کچھ سمجھنے لگے گویا اب انہیں پیر کی ضرورت نہیں۔ مگر جب ان کے شیخ کا انتقال ہوا تب انہیں پتہ چلا کہ ابھی تو انہیں بہت کچھ کرنا تھا جس میں شیخ کی موجودگی کی حاجت تھی۔ چنانچہ انہوں نے شیخ کی طرف توجہ کی اور پھر محسوس کیا کہ وہ غائب نہیں اور وقتاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فوقتاً ان کی تربیت بھی کرتے رہتے تھے[۳۳]۔ چشتیہ سلسلے کے صوفیہ پیر طریقت کو ہر شے سے افضل سمجھتے تھے اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ پیر طریقت وفات کے بعد بھی اپنے مریدوں کی راہنمائی کر سکتے تھے۔ ان کے خیال میں راہ سلوک میں کتابی علم کام نہ آ سکتا تھا اور سیدھا راستہ دکھانے کے لئے پیر ہی بہترین ذریعہ تھا۔

خواجہ صاحب نے اپنی تصنیفات کے ذریعے درس وتدریس اور رشد وہدایت کا فریضہ سرانجام دیا اور اپنے مریدوں کی رہنمائی فرمائی۔ ان کے ملفوظات ''جوامع الکلم'' میں ان کی گفتگو درج ہے جو وہ اپنی مجلسوں میں کرتے تھے۔ ان مجلسوں میں ان کا تلقین کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو حضرت محمد ﷺ، دیگر پیغمبروں اور صوفیہ کے قصے اور اسلامی تاریخ سے واقعات سناتے اور اس طرح ان باتوں سے اخلاقی نتائج نکال کر لوگوں کو امر و نہی کی طرف راغب کرتے۔ اسی طرح وہ باتوں ہی باتوں میں لوگوں کو باہمی محبت کا سبق دیتے اور بھائی چارہ بڑھانے کی تلقین کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کو درپیش مسائل کے سلسلے میں عمومی حل بھی پیش کرتے تاکہ ہر کوئی اپنے حالات کے مطابق اس سے مستفید ہو سکے۔ وہ لوگوں کو بتاتے کہ انہیں زندگی کس طرح گذارنی چاہیئے اور مصیبت میں گھبرانے کی بجائے خود کو مضبوط بنا کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ سے قریبی تعلقات رکھنے سے ہی ان کے روزمرہ مسائل احسن طریقے سے حل ہو سکتے ہیں اور اسی سے محبت وہ واحد وسیلہ ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات کے زمرے میں لا کر دیگر حیوانات سے اس کا رتبہ بلند کرتا ہے۔

خواجہ صاحب علماء کی رسمی اور ظاہری تعبیر مذہب کے خلاف تھے۔ ان کے خیال میں علماء ظاہری رسوم کے پابند ہوتے ہیں اور طلباء کو چند کتابیں پڑھا کر فارغ کر دیتے ہیں۔ اس پر سمجھتے ہیں کہ ان کا فرض ختم ہو گیا ہے۔ اس کے برعکس خواجہ صاحب سمجھتے تھے کہ ہر انسان زندگی کے باطنی مطالب سمجھنے کے قابل ہوتا ہے اور اگر اس کی صحیح راہنمائی کی جائے تو وہ دنیاوی زندگی کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ و ارفع سطح پر بھی زندگی گذارنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ دراصل مذہب کے تین عناصر ہیں۔ اعتقادات، عبادات اور اخلاقیات۔ علماء محض پہلے دو پر زور دیتے ہیں اور تیسرا جو کہ اس کا عملی پہلو ہے اس پر بہت کم توجہ دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب اپنی تعلیمات میں اسلام کے عملی پہلو یعنی اخلاقیات پر زور دیتے ہیں تاکہ انسان کو سیدھا راستہ دکھا کر اسے صحیح عمل کرنے پر اکسایا جا سکے۔ اس سلسلے میں ان کی دو کتابوں 'جوامع الکلم' اور 'خاتمہ آداب المریدین' کی مثال دی جا سکتی ہے۔

تصوف کی تاریخ میں خواجہ صاحب کا اپنا ایک مقام ہے۔ خصوصاً انہوں نے وحدت الوجود کے رائج نظریے کی مخالفت کر کے ایران میں اٹھنے والی اس نئی تحریک کو برصغیر میں رائج کیا جس کے مطابق مخلوق خالق سے علیحدہ وجود رکھتی تھی۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے درمیان اختلافات تو اپنی جگہ پر موجود ہیں مگر ان دونوں ہی نظریات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا تعلق تصوف کے فکری ارتقاء سے ہے اور تصوف کے ارتقاء کے لئے دونوں نظریات اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔ نقشبندیہ سلسلے کے قیام سے پہلے تمام صوفیہ ابن العربی کے نظریات سے متاثر تھے۔ برصغیر پاک وہند میں قادری، سہروردی اور چشتیہ سلسلے تمام کے تمام ایران اور ایران کی علمی سرحد عراق کی پیداوار تھے۔ ان سب میں وہ عجمیت جو دور عباسیہ کو دور اموی سے اور بغداد کے متکلمین اور فلسفیوں کو مدینہ منورہ کے محدثین وفقہا سے منفرد کرتی ہے موجود تھی جس کے تحت غیر مروجہ بلکہ غیر اسلامی طریقوں سے کلی پرہیز نہ کیا جاتا۔ تینوں صوفی سلسلوں میں شرع کے معاملے میں تھوڑی بہت آزادی تھی اور تینوں میں وحدت الوجود کا طریق رائج تھا۔ خواجہ باقی باللہ نے نقشبندیہ سلسلے کو رائج کیا جس پر ایران نہیں بلکہ توران کا اثر تھا اور ماوراالنہر کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اور اس میں شرع کی پابندی پر بڑا زور تھا۔

ابن العربی کے نظریات میں اخذ وانجذاب اور وحدت الشہود میں تطہیر وتزکیہ کے اصول کارفرما تھے۔ ایک کے پیرو مشابہتوں اور یک رنگیوں کو دیکھتے اور دوسرے کی نظر اختلافات پر پڑتی تھی۔ اس کے ماننے والے ابن العربیؒ، مولانا رومؒ، امام غزالیؒ، داراشکوہ، عیسائی، نوافلاطونی، ہندو فلسفوں اور ان کے طریقوں کو کھنگالتے اور دیکھتے ہیں کہ ان میں کون سی اچھی چیز ہے اور اخذ کی جاسکتی ہے۔ جبکہ ابن تیمیہؒ، ابن عبدالوہابؒ، مجدد الف ثانیؒ اور اورنگ زیب جو وحدت الوجود کے مخالف ہیں وہ سب چیزوں کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ دونوں رجحانات ہی اہم ہیں۔ اگر پہلا گروہ نہ ہوتو خیالات اور فلسفہ کی نشوونما ختم ہو جائے اور دماغ ایک تنگ وتاریک دائرے سے باہر نہ نکلے اور خیالات میں وسعت اور لچک نہ رہے۔ اگر دوسرا گروہ اپنا کام بند کردے تو ہر رطب ویابس بلکہ ملحدانہ اور مضر خیالات قبول کرلئے جائیں اور شرعی، فکری اور روحانی نظام تتر بتر ہوجائے[۳۴]۔

اختتامیہ

چودھویں صدی کے آغاز میں جب سلطان محمد تغلق نے دیوگری کو اپنا دارالسلطنت بنانا چاہا اور دولت آباد کے نام سے اسے آباد کیا تو دہلی کے عمائدین، فضلاء، علماء اور مشائخ کو وہاں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ اسی سلسلے میں خواجہ بندہ نواز اپنے ؍الد کے ساتھ سات برس کی عمر میں وہاں چلے گئے۔ طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے صرف ونحو، اصول فقہ، حدیث، تفسیر، معقول ومنقول کی تعلیم حاصل کی اور پندرہ برس کی عمر میں دہلی آکر حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلویؒ کے مرید ہوئے۔ پھر اپنی تعلیم کا سلسلہ اپنے شیخ کے کہنے کے مطابق جاری رکھا اور انیس برس کی عمر میں ان کی خدمت میں آگئے اور سترہ برس ان کی زیر تربیت رہے۔ چھتیس برس کی عمر میں اپنے شیخ کی وفات پر ان کے جانشین بنے اور چالیس برس کی عمر میں مولانا جمال الدین مغربی کی پوتی سے شادی کی۔ مولانا عمر میں ساٹھ سال بڑے ہونے کے باوجود خواجہ صاحب کے مرید تھے۔ جب تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو وہاں سے گلبرکہ چلے گئے اور بائیس سال وہاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقیم رہے۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراژ چودھویں صدی کے ایک بہت بڑے عالم، صوفی، شاعر، محدث اور محقق تھے۔ ان سے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں منسوب ہیں۔ ان کتابوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کی فارسی زبان نہایت سہل اور عام فہم ہے۔ وہ ابن العربی کے نظریۂ وحدت الوجود کے خلاف ابھرنے والے نظریہ وحدت الشہود کی برصغیر پاک و ہند میں بناڈالنے والے صوفیہ میں سے تھے۔ اس نظریے نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ تشخص دیا۔ اپنے مکتوبات میں انہوں نے ابن العربی کے وحدت الوجودی خیالات کی تردید کی اور فریدالدین عطارؒ اور مولانا جلال الدین رومیؒ کے ایسے ہی خیالات کو ناپسند کیا۔ ابن العربیؒ کے وحدت الوجود کے نظریہ کے ساتھ ساتھ وہ ان کے اس عقیدہ کو بھی غلط سمجھتے تھے کہ خدا کی ذات کچھ انسانوں میں خود کا اظہار کرتی ہے۔ خواجہ صاحب کے خیال میں خدا کوئی وجود نہ تھا اس لئے انسان کا خدا سے وصل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ابن العربیؒ دراصل روحانی حوالے کے بجائے مشاہداتی حوالے سے بات کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ابن العربیؒ کے جنت اور دوزخ اور قیامت کے بارے میں اس عقیدہ سے اتفاق نہ کرتے تھے کہ یہ سب علامتیں ہیں جو کہ انسان کی اندرونی کیفیات کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ ابن العربیؒ سے اس سلسلے میں بھی اختلاف رکھتے تھے کہ خدا سے محبت ایک دوطرفہ عمل ہے۔ ان کے خیال میں خدا ہمیشہ محب اور انسان ہمیشہ عاشق رہتا ہے۔ خواجہ صاحب چشتی روایت کے مطابق امیروں اور بادشاہوں کی صحبت سے بچتے تھے اور اپنی روحانی ترقیات کو اخفا میں رکھتے تھے۔ وہ اپنے مریدوں کو مافوق الفطرت قوتوں کے حصول کی خواہش سے منع کرتے اور اپنے پیر کو اپنے عہد کی سب سے بڑی روحانی شخصیت سمجھتے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ صوفی تھے اور شریعت کی سختی سے پابندی کرتے۔ انہوں نے شیخ ابوالنجیب سہروردی کی کتاب ''آداب المریدین'' کی عربی سے فارسی ترجمہ کیا اور شرح بھی لکھی۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر عربی میں پہلی کتاب ہے۔ انہوں نے اس سلسے میں تکملہ کے طور پر ''خاتمہ آداب المریدین'' بھی لکھی۔ اپنے ملفوظات ''جوامع الکلم'' میں بھی انہوں نے اپنے مریدوں کے لئے ہدایات جاری کی ہیں۔ خواجہ صاحب مرید بنانے کے ساتھ درس و تدریس کا کام بھی سرانجام دیتے۔ وہ تفسیر و حدیث و فنون اور کبھی کبھی علم کلام و علم فقہ کا بھی درس دیتے تھے۔ اپنی مجالس میں اسلامی تاریخ سے مختلف قصے اور دیگر واقعات سنا کر لوگوں کی توجہ اسلام کے اخلاقی پہلو کی طرف دلاتے۔

مولانا سماع کے قائل تھے مگر اس میں حد درجہ احتیاط برتتے تھے۔ مریدوں کو دنیاداروں کی صحبت سے بچنے کی تلقین کرتے، اپنے شیخ سے حد درجہ محبت کرتے اور سب مریدوں کو اپنے شیخ سے گہرے تعلقات استوار کرنے کی تلقین کرتے کیونکہ چشتیہ سلسلے کے صوفیہ کی یہی روش رہی ہے۔ حضرت خواجہ انسانی زندگی ہی میں رویت باری کے قائل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے۔ یعنی یہ کہ انسان اسی زندگی میں خدا کا دیدار کر سکتا ہے۔ جبکہ بعض صوفیہ کے خیال میں رویت باری صرف موت کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود اپنے تجربے کی بناء پر کہتے تھے کہ انہوں نے خود رویت باری کی ہے اور یہ کہ خدا کے اپنے نور کے ذریعے اور محض آنکھوں سے نہیں بلکہ تمام جسم سے رویت باری ہوتی ہے۔ حضرت خواجہ کا مشائخ چشت میں ایک خاص مشرب اور مخصوص طریقہ تھا۔ آپ اپنے مریدوں کو پانچ وقت با جماعت نماز پڑھنے اور ہمیشہ زبان اور نگاہ کی حفاظت کرنے کی تلقین کرتے۔ حکمرانوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ انہیں منصف اور غریبوں کا مدرد ہونا چاہیئے۔ انہیں اسلام کو پھیلانا چاہیئے اور ایماندار لوگوں کو انتظامیہ میں رکھنا چاہیئے۔ خشک سالی کے وقت بادشاہ کو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر زمین میں ہل چلانا چاہیئے ایسے کہ وہ فقیروں سے بھی بدتر دکھائی دے تا کہ خدا اس سرزمین پر اپنا فضل بھیجے۔ تصوف کی تاریخ میں خواجہ بندہ نواز منفرد مقام کے حامل ہیں اور ان کے خیالات سے ہم اس دور کے فکری، مذہبی و سماجی حالات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۷، ۵۸۵۔

۲۔ بندہ نواز گیسو دراز، خاتمہ آداب المریدین، ترجمہ معین الدین دردائی، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۷۶ء، ۸۱۔

۳۔ ایضاً، جوامع الکلم، ترجمہ معین الدین دردائی، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۰ء، ۳۴۔

۴۔ ایضاً، ۸۷۔

۵۔ ایضاً، خاتمہ آداب المریدین، ۸۱۔

۶۔ سید اطہر عباس رضوی، اے ہسٹری آف صوفی ازم ان انڈیا، دہلی، منشی منوہر لال، ۱۹۸۶ء، جلد اول، اشاعت ثانی، ۲۴۸۔

۷۔ ایضاً، ۲۵۳، ۲۵۴۔

۸۔ ابوالنجیب سہروردی، آداب المریدین، ترجمہ محمد عبدالباسط، لاہور، اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۰ء، ۹۔۱۰۔

۹۔ بندہ نواز گیسو دراز، جوامع الکلم، ۴۹۔۵۲۱۔

۱۰۔ ایضاً، ۱۷۵۔

۱۱۔ ایضاً، ۴۳۱۔۴۳۳۔

۱۲۔ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، ترجمہ مولانا سبحان محمود، کراچی، مدینہ پبلشنگ ہاؤس، ۲۸۵۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۳۔ بندہ نواز گیسودراز، خاتمہ آداب المریدین، ۳۷۔

۱۴۔ ایضاً، ۵۹۔

۱۵۔ ایضاً، جوامع الکلم، ۲۱۸۔۲۱۹۔

۱۶۔ ایضاً، خاتمہ آداب المریدین، ۳۸۔

۱۷۔ ایضاً، جوامع الکلم، ۵۷۵۔

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ ایضاً، خاتمہ آداب المریدین، ۸۳، ۸۶۔

۲۰۔ ایضاً۔

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ ایضاً، جوامع الکلم، ۳۰۳، ۳۸۲۔

۲۳۔ ایضاً، ۳۸۲، ۲۶۰، ۲۶۱۔

۲۴۔ ایضاً۔

۲۵۔ ایضاً، خاتمہ آداب المریدین، ۲۲۹۔

۲۶۔ ایضاً، ۲۳۸، ۲۳۹۔

۲۷۔ ایضاً، جوامع الکلم، ۴۹۶۔

۲۸۔ ایضاً، ۴۹۵۔

۲۹۔ ایضاً، خاتمہ آداب المریدین، ۹۷۔

۳۰۔ ایضاً، ۳۴۷۔

۳۱۔ سلطان باھو، رسالہ حق نما، مترجم و ناشر فقیر نور محمد سہروردی قادری، ۱۹۷۶ء، ۱۶۸۔

۳۲۔ بندہ نواز گیسودراز، خاتمہ آداب المریدین، ۱۱۴۔۱۲۳۔

۳۳۔ ایضاً، ۱۲۸۔۱۳۱۔

۳۴۔ شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۰ء، طبع سیزدھم، ۵۰۳۔۵۱۴۔

© rasailojaraid.com